تفہیم
PUBLICATION

قدرِ ایاز

انتخاب شعر ایاز رسول نازکی

ڈاکٹر لیاقت جعفری
ڈاکٹر محمد سلیم
عمر فرحت

قدرِ ایاز

(انتخابِ شعرِ ایاز رسول نازکی)

مرتبین :

ڈاکٹر لیاقت جعفری / ڈاکٹر محمد سلیم

عمر فرحت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

QADRE AYAZ

A Selection of Poetry of Ayaz Rasool Nazki

Edited by

Dr. Liaqat Jafri / Dr. Mohd. Saleem
Umar Farhat

Year of Edition 2017

ISBN 978-93-86624-10-9

Price Rs. 400/-

نام کتاب : قدرِ ایاز (انتخابِ شعرِ ایاز رسول نازکی)

مرتبین : ڈاکٹر لیاقت جعفری / ڈاکٹر محمد سلیم / عمر فرحت

موسمِ اشاعت : ۲۰۱۷ء قیمت : ۴۰۰ روپے

زیرِ اہتمام : تفہیم پبلی کیشنز، راجوری، جموں کشمیر (انڈیا)

omerfarhat519@gmail.com

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

ملنے کے پتے

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph.: 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

کشمیر میں اُردو شاعری

کے

دبستانِ نازکی

کے نام

ہمدانی مصحفی

لے گئے سب بدن زمین میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

امجد اسلام امجد

قدرِ ایاز

بھائی لیاقت جعفری اور عزیزی عمر فرحت کی معرفت سرینگر کے ایک سینئر شاعر ایاز رسول نازکی کے تیسرے اور زیرِ طبع شعری مجموعہ ''قدرِ ایاز'' کا مسودہ نظر سے گزرا تو بقول فراق گورکھ پوری '' دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں'' بات کچھ یوں ہے کہ سرحدوں کے اس طرف واقع وادی کشمیر کے حوالے سے سیاسی بیانات فوجی کاروائیوں اور عوامی جدوجہد کی خبریں تو کسی نہ کسی حوالے سے ملتی رہتی ہیں مگر وہاں کے نمائندہ اہلِ قلم کون کون ہیں اور وہ کیا سوچ اور لکھ رہے ہیں اس کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں چل پاتا، کبھی کبھار لیاقت جعفری کے نظر نواز اور خیال افروز رسالہ '' بے باگ'' کی طرح اِکا دُکا ملنے والے رسائل میں وہاں کے احباب کی لکھی ہوئی کچھ تحریروں سے رابطے کی صورت نکل تو آتی ہے مگر یہ عمل اس قدر بے ترتیب اور محدود ہے کہ اس سے وہاں کی ادبی صورتِ حال کے بارے میں کوئی نظریہ یا تصور قائم کرنا عملی طور پر ناممکن ہے۔ مختلف اوقات میں کچھ ایسے بھارتی ادیب دوستوں سے ملاقات تو رہی کہ جو کسی نہ کسی حوالے سے جالندھر، سرینگر یا مقبوضہ کشمیر کے کسی علاقے میں ملازمت یا کسی اور حوالے سے مقیم رہے ہیں، اسی طرح کچھ ایسے کشمیری احباب سے بھی امریکہ، یورپ، کینیڈا یا مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں رابطہ ہوا جو یا تو خود ادیب تھے یا ادب سے دلچسپی رکھتے تھے لیکن بات پھر بھی اجمالی خاکے تک ہی محدود رہی

کہ بوجوہ ''پورا سچ'' بولنا کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ چند برس قبل جموں یونیورسٹی کی ایک طالبا افشاں لطیف نے میری شاعری پر پی ایچ ڈی کا تھیس لکھا تو فون، خطوط اور کتابوں کے تبادلے کے باعث صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی مگر اس کے بعد پھر معاملات پہلے والی روش پر آ گئے۔

اب جو ایک ایسی کتاب پڑھنے کو ملی ہے جس میں وہاں کی شعری فضا کے ساتھ ساتھ کشمیر کی موجودہ صورتِ حال میں لکھنے والوں کی سوچ کا ایک روپ بھی سامنے آیا ہے تو جی چاہا کہ اس گفتگو میں آپ کو بھی شریک کیا جائے، سو جو تحریر میں نے کتاب کے فلیپ نما دیباچے کے لئے لکھی ہے اس کو یہاں بھی نقل کر رہا ہوں کہنے کو تو یہ ایک تبصرہ نما تاثراتی مضمون ہے مگر اس میں کئی ایسے سوالوں کے جواب بھی پوشیدہ ہیں جو اکثر ذہنوں پر دستک دیتے رہتے ہیں۔

''**قدرِ ایاز**'' کے شاعر ایاز رسول نازکی صاحب نے کتاب کے عنوان میں جس رعایت لفظی کا اہتمام کیا ہے اس کے مظاہر ہمیں اس کتاب کے آغاز میں درج مصحفی کے اس شعر سے ہی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ:

لے گئے سب بدن زمین میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

اردو غزل کی روایت کا ایک بہت انوکھا اور شاندار کمال یہ بھی ہے کہ اس کی جدید ترین شکل میں بھی آپ کو کلاسیکیت کی ایک گونج سی ہمیشہ سنائی دیتی ہے۔ برصغیر کے مختلف علاقوں اور ادوار میں اس کے رنگ بدلتے ہوئے دکھائی تو دیتے ہیں مگر آگے چل کر یہ ایک ایسے پرزم prism کی شکل بھی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں جہاں کسی رنگ کو دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا ناممکن حد تک مشکل ہوتا چلا جاتا ہے۔ زبان کی حد تک کشمیر کی وادی اور ملحقہ علاقوں کا تعلق اردو سے بہت پرانا ہے (آج بھی یہ بھارت کی واحد اگرچہ

متنازع ریاست ہے جسکی سرکاری اور پہلی زبان اردو ہے۔) اردو فکشن اور شاعری میں بھی کشمیر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کا بہت کم حصہ خود وہاں کے ریائشی کشمیری اہلِ قلم کا ہے بالخصوص تقسیم ہند کے بعد اور تحریک آزادی کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی بہت ہی کم تحریریں باہر کی دنیا تک پہنچ پائیں، ایسے میں ایاز رسول نازکی کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ''قدرِ ایاز'' بہت حد تک اس کمی کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔ان کے اس سے قبل شائع ہونے والے مجموعے ''خودرو'' اور ''شام سے پہلے'' کتابی شکل میں تو مجھے حاصل نہیں ہو سکے لیکن لیاقت جعفری اور عمر فرحت کی مدد سے ان کا ایک انتخاب دیکھنے کا موقع مل گیا ہے جس کے لئے میں ان دونوں ادب کے دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ آیئے اب پہلے ''قدرِ ایاز'' میں سے خالص تغزل اور مضمون آفرینی کے حاصل کچھ اشعار دیکھتے ہیں :

یہ وحشت جو ہو جائے کم دیکھتے ہیں
چلو شعر کہہ کے بھی ہم دیکھتے ہیں

آ کے لپٹا جو تری دید کا دریا مجھ سے
رات سمٹا نہ تری یاد کا صحرا مجھ سے

کام آؤ نہ کسی کے تو کوئی بات نہیں
کوئی مشکل تو نہیں ہے کہ دعا کر نہ سکو

اجنبی نے سنا ہے بستی میں
ایک ہی گھر کا راستہ پوچھا

سیکھنے سے ہنر تو آتا ہے
شاعری میں اثر نہیں آتا

زمانہ مرے ساتھ تب بھی نہ تھا
مگر تم مرے خیر خواہوں میں تھے

میں لوگوں کی اس بھیڑ میں سوچتا ہوں
مرا نام کیا ہے ! مرا نام کیا تھا !

شاعروں کی آنکھ کو "دیدہ ٔ بینا" اس لیے ہی کہا گیا ہے کہ یہ منظر کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر اور پیش منظر کو بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک حساس، انسان دوست اور حقیقت پسند شاعر اپنے اردگرد ہونے والے ان واقعات کو موضوع نہ بنائے جن سے وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے جڑا ہوا ہے۔ سو ایاز رسول نازکی کے اس مجموعے میں بھی آپ کو قدم قدم پر ایسے اشعار ملیں گے جن کا سلسلہ شاعر کے بارے میں اقبال کی اس سوچ سے ملتا ہے کہ :

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

"**قدر ایاز**" جستہ جستہ چنے ہوئے یہ چند شعر وادی کشمیر کی وہ شکل ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے ناظر اور صورت گر دونوں کا تعلق اس دھرتی اور اس پر رونما ہونے والے ان واقعات سے ہے جو نہ صرف کشمیریوں بلکہ پورے ضمیر آدم کے لئے اس عہد کا سب سے بڑا سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں :

جن کو مطلوب ہیں جواں سارے
میری بستی ہے ان کے گھیرے میں

رات ہی رات ہے ہمارے یہاں
صبح کیسی، یہاں صبا کیسی

ہر ایک شخص نے تعبیر اپنی سوچی ہے
سنا ہے شہر کے ناظم کو خواب آنے والا ہے

خون بہتا نہ شاہراہوں میں
عقل ہوتی جو بادشاہوں میں

کچھ ہوا ہے کہیں پہ وادی میں
پھر ہوا بے قرار پھرتی ہے

مری ماں نے مجھ کو جنم جب دیا تھا
میں لاشوں کے انبار پر جا گرا تھا

یہیں پر اسے جان دینے کی ضد تھی
یہیں سے وہ پرچم اٹھا کر چلا تھا

گھر سے چلتے میں نے اکثر سوچا ہے
شاید ہی میں لوٹ کے آؤں شام گئے

"**قدرِ ایاز**" کی شاعری غزل کی روایت اور عصری شعور دونوں حوالوں سے قابلِ تحسین ہے اور اس کے لئے ہمیں اس کتاب کے مرتبین لیاقت جعفری اور عمر فرحت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ادب اور کتاب کے اس زوال آمادہ دور میں انہوں نے ہمیں ایسی اچھی شاعری پڑھنے کے لئے مہیا کی۔

امجد اسلام امجد
(بہ شکریہ کالم چشمِ تماشا، روزنامہ ایکسپریس پاکستان
۲ / جون ۲۰۱۷ء)

☆☆☆

غزلیات

میں جب خود ہی خود سے غافل ہو جاتا ہوں
تب ہی تیرے دھیان کے قابل ہو جاتا ہوں

چوراہے پر اندھے بہرے گونگے لوگ
میں کیوں ایسی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہوں

دن کو بچائے پھرتا ہوں میں اپنی جان
رات کو اکثر اپنا قاتل ہو جاتا ہوں

غیر مکمل میں بھی تیرے چھونے سے
ایک ہی پل میں لیکن کامل ہوجاتا ہوں

ریزہ ریزہ تم بھی مجھ کو چنتے ہو
لمحہ لمحہ میں بھی زایل ہو جاتا ہوں

چشم تر ہے عذاب آئینہ
بن گیا ہے سراب آئینہ

آبرو شوق میں گنوا بیٹھے!
مانگتا ہے حساب آئینہ

محتسب سے نظر چراتے ہیں
طاقچے پر کتاب آئینہ

میرے باطن میں جھانکنے والے
ہو تیرا کامیاب آئینہ

رات بیٹھا تھا چاند سرہانے
ہاتھ میں تھا گلاب آئینہ

جس نے دیکھا وہ مر گیا لیکن
زندگی لاجواب آئینہ

☆☆

لے شوق! کہ ہم کوچۂ دلدار میں پہونچے
لے عقل! کہ ہم وادیِ پر خار میں پہونچے

وہ خار ہوں پہونچی نہ زباں قطرۂ خوں تک
سو آبلہ پا وادیٔ پر خار میں پہونچے

لڑکوں کی گلیلوں سے گرے موج ہوا سے
صد حیف ثمر ایسا نہ بازار میں پہونچے

آخر ہوئی نیلام بزرگوں کی حویلی
عزت جو بچی اتنی کہ دستار میں پہونچے

نکلے تھے زمانے کو بدل ڈالیں سراسر
تھک ہار کے پھر کوچہء دلدار میں پہونچے

ہم رنگ زمیں دام یہاں بھی تھا وہاں بھی
ہم لوگ بھی مرغان گرفتار میں پہونچے

اک ایسا جزیرہ ہے سمندر میں ہمارا
اترے جو کسی گھاٹ تو ہم غار میں پہونچے

پروانے ہوں یا عود ہو عنبر ہو کہ شمعیں
سب خاک ہوئے جو تری دربار میں پہونچے

ہر طرف سے زمین دھنستی ہے
کوئی پھر بھی مکاں بناتا ہے

روز گھڑتا ہے اک نئی تہذیب
روز تازہ جہاں بناتا ہے

اس نے تازہ زمین کھوجی ہے
اب نیا آسماں بناتا ہے

لا کے صحرا کو ایک ذرے پر
بوند کو بیکراں بناتا ہے

دو لکیروں میں کیا کہانی ہے
بس یہی اک نشاں بناتا ہے

کوئی رشتہ نیا ہے بننے کو
دیکھئے اب کہاں بناتا ہے

اب وہ آدم نیا بنائے گا
پھر نیا اک سماں بناتا ہے

یہ وحشت جو ہوجائے کم دیکھتے ہیں
چلو شعر کہہ کر بھی ہم دیکھتے ہیں

بڑی دیر سے چشمِ نم دیکھتے ہیں
کہاں تک کریں گے کرم دیکھتے ہیں

ہے سورج نکلنے کی امید بھی
ابھی تک ہے قائم بھرم دیکھتے ہیں

وہاں پر ہو بہتر یہاں سے ہے ممکن
تیری راہ کب سے عدم دیکھتے ہیں

کہاں چشمِ ساقی کے جادو سے چھوٹے
کہاں گیسوؤں کے وہ خم دیکھتے ہیں

نہ ہم دوستوں کے ستم دیکھتے ہیں
نہ اب دشمنوں کے کرم دیکھتے ہیں

نہ جنبش ہی دیکھیں وہ ہاتھوں میں غالبؔ
نہ اب آنکھ میں کوئی دم دیکھتے ہیں

تجھے کچھ خبر ہے تہی دست ساقی
ترے ہاتھ میں جامِ جم دیکھتے ہیں

☆☆

غم کی وادی میں غم کرتے
کس کس کا اب ماتم کرتے

خون کا بدلہ کیا وہ دیتے
آنکھیں اپنی ہی نم کرتے

قاتل اب تو صدیاں گزریں
عہد و پیماں باہم کرتے

چاند پہ گھوڑے باندھے ہم نے
بجھتے سورج پر دم کرتے

ایک ہی گھونٹ سمندر پیتے
صحرا ذرے میں ضم کرتے

☆☆

چاند راتیں وہ خواب کی راتیں
اب کے جو ہیں عذاب کی راتیں

بام پر کس کے چاند ہوتا ہے
کس کے ہاں ہیں جناب کی راتیں

ہم تہجد گذار ہیں لوگو
ہجر کی ہیں ثواب کی راتیں

پھول سے لب گلاب کی راتیں
وہ جبیں آفتاب کی راتیں

آ کے پیری میں کیوں ستاتی ہیں
کب کے گذرے شباب کی راتیں

پھر وہی اضطراب کی راتیں
عشق خانہ خراب کی راتیں

نصف شب اٹھ کے شعر کہتے ہیں
دوڑتے ہیں سراب کی راتیں

کس کو دیکھا کسے نہیں دیکھا
لمحہ لمحہ حساب کی راتیں

لاکھ سورج فدا ہوئے جن پر
وہ علی بو تراب کی راتیں

آ کے لپٹا جو تری دید کا دریا مجھ سے
رات سمٹا نہ تری یاد کا صحرا مجھ سے

میں نہیں ہوں تو بھلا ذکر کریں گے کیونکر
جب تلک ہوں تو میرے نام کا چرچا مجھ سے

میری آنکھوں میں بصارت ہے بصیرت بھی ہے
میرے وجدان کا پھیلا ہے اجالا مجھ سے

مست مولا وہ سرِ خاک یہی کہتا تھا
خود مرا فقر بھی مانگے ہے دلاسا مجھ سے

ان گنت زخم دیے اس نے سرِ عام مجھے
کون سی بات تھی خنجر نہ چھپاتا مجھ سے

کوئی مفرور ہے پھر ذات کے چڑیا گھر سے
لوگ کہتے ہیں کہ ملتا ہے سراپا مجھ سے

دل کو پھر رات گماں تھا کسی آمد کا عدو
وہ دلاتا رہا پھر رات کو پہرہ مجھ سے

کس نے سوچا تھا وہ منزل ہی بنے گا میری
اس نے پوچھا تھا کسی موڑ پہ رستہ مجھ سے

چشمے سارے سوکھ گئے ہیں بوند کہیں اک پانی ہے
درد کے دریا اب کے موسم تجھ پر کیوں طغیانی ہے

آئینے میں میں نے دیکھا اس کی صورت بدلی سی
وہ بھی مجھ کو دیکھ کے چونکا اس کو بھی حیرانی ہے

اس کا سارا جسم کٹا ہے اس کا کتنا خون بہا
حیرت کی یہ بات ہے لوگو چہرے پر تابانی ہے

لوگ بھی بدلے یگ بھی بدلا عشق ہے اب بھی کارِ جنوں
اِس کا رشتہ روز کٹھن ہے اس میں کب آسانی ہے

پہلے کب امید کا گلشن تاخت ہوا تاراج ہوا
شہرِ تمنا تجھ پر کیسی اب کے یہ ویرانی ہے

کھیتوں میں وہ فصلیں بونا ہم نے کب کا ترک کیا
پانی کی یہ قلت کیسی خون کی کیا ارزانی ہے

پگڑی اچھلے بیچ سڑک کے یہ تو اس کا شیوہ ہے
اس سے بھڑنا چوراہے پر اپنی ہی نادانی ہے

وہ جو میری غزلیں نظمیں تنہائی میں گاتی ہے
وہ ہے میرے فن کی عاشق میری کب دیوانی ہے

جانے والے موسم آخر اک دن لوٹ کے واپس آ
ہم تو سنتے آئے ہیں یہ دنیا آنی جانی ہے

سورج کی ان پہلی کرنوں کا ہم کیسے شکر کریں
رات ہماری کرب میں گذری صبح تو خیر سہانی ہے

☆☆

ہوں شکستہ بال و پر ایسا نہیں
اب کے موسم میں اثر ایسا نہیں

درد کا احساس بھی جاتا رہا
خود سے بھی ہوں بے خبر ایسا نہیں

اک دیے کی بس رفاقت چاہیے
ہو شبِ غم کی سحر ایسا نہیں

اک دیا دہلیز پر ہو منتظر
راہ میں شمس وقمر ایسا نہیں

دل سے نکلا وہ پری چہرہ خیال
لوٹ کر آجائے گھر ایسا نہیں

جس کا دروازہ کھلا ہو رات دن
اب خدا کا کوئی گھر ایسا نہیں

گھر کے آنگن میں ہرا اک پیڑ تھا
ساری دنیا میں شجر ایسا نہیں

☆☆

قرض اتنا نہ اٹھاؤ کہ ادا نہ کرسکو
درد اتنا نہ بڑھاؤ کہ دوا نہ کرسکو

انس اتنا نہ بڑھاؤ کسی نخچیر کے ساتھ
پھر قفس سے اسے چاہو بھی رہا نہ کرسکو

کام آؤ نہ کسی کے تو کوئی بات نہیں
کوئی مشکل تو نہیں ہے کہ دعا نہ کرسکو

اس کے گیسو سے مجھے آئے مہک تھوڑی سی
ایک چھوٹا سا مرا کام صبا کر نہ سکو!

عین ممکن ہے کہ تخلیق سے خالق ہو جاؤ
لاکھ چاہو بھی مگر بت کو خدا کر نہ سکو

کہا ہے کس نے تمام دے دے
ہمارے حصے کے آم دے دے

یہ طفلِ مکتب اگر نہیں ہے
تو اس کے ہاتھوں زمام دے دے

تو چار اینٹوں کو جوڑ تو لے
ہے عین ممکن وہ بام دے دے

کہاں سے آئی کہاں گئی وہ
ڈھلے نہ شب بھر وہ شام دے دے

خرد کے ماروں کی یہ سزا ہے
میرے جنوں کو دوام دے دے

ہمارے ہاتھوں میں جو نہیں ہے
اب ہم کو وہ انتظام دے دے

ہیں جتنے مفلس ترے جہاں میں
جو دے سکے ان کو کام دے دے

یہ کیا کہ بانٹے کرن کرن تو
جو دے تو ماہِ تمام دے دے

ہمارے ہاتھ بندھے تھے نہیں تو کیا کرتے
کمالِ عرض جنون میں بھی ہم دعا کرتے

تمام صبح تمنا ہوئی سرِ مقتل
شب فراق گزاری صبا صبا کرتے

ہم اپنے درد کا درمان خود نہیں کرتے
پڑی ہے غیر تجھے کیا کہ جو دوا کرتے

چلو تمہاری کتابیں ہی معتبر ٹھہریں
تمہارے نام ہے واجب تو پھر ادا کرتے

کسے گمان تھا چشمے بھی خشک ہوتے ہیں
ہماری چشم سے آنسو نہ یوں بہا کرتے

ہٹاتے ان کو بھلا منصفی کے منصب سے!
ہمارے حق میں اگر وہ نہ فیصلہ کرتے

ہماری آنکھ پہ پہرا نظر پہ پہرا ہے
ہمارے دل پہ ہے پہراہ جگر پہ پہرا ہے

یہاں پہ کوچہ و بازار ہیں نگاہوں میں
یہاں پہ روزن و دیوار و در پہ پہرا ہے

ہر ایک جسم ہے زنجیر میں مگر پھر بھی
الگ سے ہاتھ پہ پاؤں پہ سر پہ پہرا ہے

ملا تو تجھ سے بہت بار دلنشیں کشمیر
کہیں پہ زلف ، کہیں لب ، کمر پہ پہرا ہے

اڑے نہ کوئی پرندہ کہیں فضاؤں میں
امیرِ شہر کا فرمان ، پر پہ پہرا ہے

ہمارے باغ کا ہر پیڑ ہے حراست میں
ہر ایک پیڑ کی ہر شاخ ، ثمر پہ پہرا ہے

ہزار بار وہ اس شب میں بھی طلوع ہوتا
وہ آفتاب ہے قیدی سحر پہ پہرا ہے

حسین آل حسین آج تک پیاسے ہیں
زبانیں سوکھ گئی ہیں نہر پہ پہرا ہے

موسمِ گل خیمہ زن ہے ہوشیار
تاک میں شاخِ سمن ہے ہوشیار

مشک پھرتی ہے کسی بھی بھیس میں
زلف آہوئے ختن ہے ہوشیار

اس طرف ہے وہ چمن تو دیکھنا
اس طرف رشکِ چمن ہے ہوشیار

رنگ ہیں صد رنگ ہیں سب دل نشیں
ایک ہی بس پیرہن ہے ہوشیار

نور کا پر تو پڑا ہے خاک پر
نور ہی کوہ و دمن ہے ہوشیار

اس طرف ہے چشمہ ءآب حیات
اِس طرف چاہِ ذقن ہے ہوشیار

طایرِ دل دام ہے پھر خوشنما
سامنے وہ گلبدن ہے ہوشیار

پھول سے وہ لب اگر کھلنے لگیں
گلستاں سا وہ دہن ہے ہوشیار

اس کی لٹ سے مت الجھنا مار ہے
کان کی لو اس کا پھن ہے ہوشیار

شعر گھڑنے میں بھلا کیا سروری
شاعری بھی کوئی فن ہے ہوشیار

☆☆

جو تیری بستی کا باشندہ ہوا
مسکرایا بھی تو شرمندہ ہوا

رات گیسو میں مہکتا پھول تھا
صبح سورج بن کے تابندہ ہوا

میں سرابوں سے پرے ہوں دوستو
ریت پی پی کر میں پائندہ ہوا

میں کہ جس کے نام سے واقف نہیں
میں اسی بستی کا باشندہ ہوا

واقعہ اب کے ہوا اک رات کو
آئینہ دیکھا تو شرمندہ ہوا

میرے حق میں فیصلہ ہونے کو تھا
وقت آخر پھر سے آئندہ ہوا

سامنے دیوار پر پھر نیم شب
ایک چہرہ کل بھی تابندہ ہوا

زندگی ہی زندگی ہے بس ایاز
مرگیا کوئی تو کب زندہ ہوا

☆☆

یہاں تو شہر سے دیوار و در ہی غائب ہیں
چھتوں کے بعد مکانوں کو لے اڑی ہے ہوا!

تمام شہر تھا سڑکوں پہ آج رات گئے
سنا ہے پھر سے جوانوں کو لے اڑی ہے ہوا

سفر ہے رات کا صحرا سے واپسی کیسی
تمہارے سارے نشانوں کو لے اڑی ہے ہوا

چلے گی وقت کی آندھی تو کس کو بخشے گی
نہ جانے کتنے زمانوں کو لے اڑی ہے ہوا

رہا نہ اب وہ لبِ جو رہا نہ مے خانہ
ہمارے سارے ٹھکانوں کو لے اڑی ہے ہوا

چلو وہ وصل کا وعدہ بھی کالعدم ٹھہرا
تمہارے سارے بہانوں کو لے اڑی ہے ہوا

ہوا کے دوش پہ اڑتے تو ہیں پرندے پر
نظر کے سامنے دانوں کو لے اڑی ہے ہوا

پڑے ہیں تیر یہاں غازیوں کے ترکش میں
اندھیری شب میں کمانوں کو لے اڑی ہے ہوا

غلط تھے سارے وہ میزاں فریب تخمینے
ہمارے سارے گمانوں کو لے اڑی ہے ہوا

رکھے تھے کس نے وہ اوراق طاقچے پہ ایازؔ
وہ چاہتوں کے فسانوں کو لے اڑی ہے ہوا

☆☆

خیر کے ساتھ شر نہیں آتا
پھر عدو بھی ادھر نہیں آتا

رات بھر ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
اس گلی میں وہ در نہیں آتا

کچھ تو اس میں بھی مصلحت ہوگی
ہم سے ملنے وہ گھر نہیں آتا

کج کلاہی کی اپنی فطرت ہے
ہر کلاہ میں یہ سر نہیں آتا

ہم بھی اس راستے نہیں گزرے
یار بھی راہ پر نہیں آتا

آسمانوں میں ایک طایر ہے
جو کبھی فرش پر نہیں آتا

سیب کے پیڑ سب ہرے لیکن
ان پہ اک بھی ثمر نہیں آتا

ہر طرف یاس کا ہی صحرا ہے
آس کا اک شجر نہیں آتا

☆☆

وہ آ گئے کہ گئی رات دن ہوا روشن
چراغِ چشم ہوا تھا ابھی صبا روشن

لگا ہے آج بھی پلکوں پہ رتجگا کوئی
کیا ہے آج بھی یادوں کا اک دیا روشن

تمہارے رخ پہ چمکتی ہے چاندنی ایسی
تمہاری زلف کا ہوتا ہے سلسلہ روشن

یہاں کی ریت پہ شبنم کا رقص ہوتا ہے
اندھیری رات میں دیکھا ہے کربلا روشن

نہ جانے آج کے انداز کیسے بدلے ہیں
نہ چشمِ بادہ فروزاں نہ میکدہ روشن

کہاں پہ آگ لگی ہے کہاں تمازت ہے
نظر میں آگ نہیں ہے مگر فضا روشن

تمہارے ساتھ غزل کی نئی رتیں ہونگی
تمہارے حق میں رہے گی مری دعا روشن

اگر یہ صبح درخشاں نہیں تو پھر کیا ہے
اندھیری رات میں ہوتا نہیں دیا روشن

ہمارے گھر سے جو گزرا ہمیں خبر کرتا
تمام شہر میں ہم کو وہ معتبر کرتا

اگرچہ ایک ہی منزل کے ہم مسافر تھے
کہاں پہ بخت مرے ساتھ وہ سفر کرتا

رکا نہیں وہ سنی اس نے ان سنی کردی
اگر وہ پل کو ٹھہرتا سنا اثر کرتا

یہ رات کیسے ڈھلے گی کسی کو علم نہیں
کسی کے بس میں نہیں ہے اسے سحر کرتا

ہوا نہ آج بھی طے مرحلہ کوئی مجھ سے
رہا میں سامنے بیٹھا ادھر ادھر کرتا

☆☆

تیر دیتا کمان دیتا ہے
اور پھر اپنی جان دیتا ہے

جس قدر دھوپ کی تمازت ہے
اس قدر سائبان دیتا ہے

کوئی منزل کی کھوج میں نکلے
راستہ کاروان دیتا ہے

جن کو کہنے کو کچھ نہیں دیتا
ان کے منہ میں زبان دیتا ہے

جب پرندوں کے پر نہیں رہتے
اڑنے کو آسمان دیتا ہے

آج کی رات سو نہیں جانا
یہ صدا پاسبان دیتا ہے

عشق والوں پہ جو گزرتی ہے
عشق اک داستان دیتا ہے

بہرے لوگوں کی ایک بستی ہے
کوئی گونگا اذان دیتا ہے

بوسہ دیتا نہیں چلو پھر بھی
پھر مکرر زبان دیتا ہے

اگلے ہفتے وہ قایدِ دوران
دیکھئے کیا بیان دیتا ہے

☆☆

میرے ہاتھوں میں تھمایا ہے یہ پتھر کس نے
میرے ہاتھوں سے ہی توڑا ہے مرا سر کس نے

میرے شجرے کی ہر اک شاخ جہاں تھی پیوست
میرے جاتے ہی جلایا ہے وہ دفتر کس نے

جب زمیں چھوٹ گئی تب کوئی بولا پوچھو
آسماں آج اٹھایا ہے یہ سر پر کس نے

اب گذارے تو کوئی کیسے شبِ درد و ملال
میرے زخموں میں گذارا ہے یہ نشتر کس نے

میرے آنگن میں تو غیروں نے جمائے ڈھیرے
تیرے سامان کو پھینکا ہے یہ باہر کس نے

ایک درویش نے ساحل پہ یہ پوچھا مجھ سے
پی لیا رات کو میرا یہ سمندر کس نے

نازکی اور ہیں شاعر بھی ہیں دانشور بھی
تجھ کو مانا ہے ایازؔ اب کے سخنور کس نے

تمہارا حال بھی تب سے خراب گزرا ہے
ہمارے سر سے بھی اب کے عذاب گزرا ہے

امیرِ شہر نے سارے چراغ ضبط کیے
ہمارے شہر سے کیوں آفتاب گزرا ہے

وہی ہے حس کے تعاقب میں سنگ باڑی ہے
یہاں وہاں سے وہ عالی جناب گزرا ہے

تری نظر نے جسے آبدیدگی بخشی
مری نظر سے وہ چشمہ سراب گزرا ہے

نہ جانے کون تھا رومیؔ تھا شمسؔ تبریزی
جلا کے شہر سے ہر اک کتاب گزرا ہے

کھلا بھی آج ہی مہکا بھی اور مرجھایا
چمن سے ایک ہی دن میں گلاب گزرا ہے

تمام رات رہا منتظر میں اس کی بالیں پر
وہ میرے خواب سے بھی محوِ خواب گزرا ہے

ورق ورق ہے درختوں میں چاندنی اب بھی
یہاں سے رات کوئی ماہتاب گزرا ہے

ابھی تلک ہے رگ وپے میں سنسنی باقی
کسی بدن سے کوئی بے حساب گزرا ہے

ابھی ٹنگی ہے فضاؤں میں ایک پرچھائیں
سنا ہے یاں سے کبھی اک عقاب گزرا ہے

بڑا ہے جشن کا ماحول دل کی نگری میں
کوئی تو شاہ کوئی تو نواب گزرا ہے

نہیں زبان میں لکنت نہ ہاتھ لرزیدہ
ہوائے شوق ہے پر اضطراب گزرا ہے

ہوا کے دوش پہ عکسِ سراب گزرا ہے
اسی گلی سے وہ مستِ شباب گزرا ہے

ایاز آ کے یہاں تک پلٹ گیا آخر
ہر ایک موڑ سے جو کامیاب گزرا ہے

ایاز جس کا بدن سے کبھی تعلق تھا
یہاں حباب وہاں پر سحاب گزرا ہے

☆☆

نام پوچھا مرا پتا پوچھا
اور کچھ بھی نہ باخدا پوچھا

اجنبی نے سنا ہے بستی میں
ایک ہی گھر کا راستہ پوچھا

توڑ کر اس نے سارے دروازے
مجھ سے آکر مرا پتا پوچھا

تم تو خود بھی شریک محفل تھے
میرے بارے میں اس نے کیا پوچھا

کیا ہوا تھا کسی کو علم نہیں
ہم نے کس سے نہ ماجرا پوچھا

زلف جیسی طویل راتوں کا
ہم نے ان سے بھی سلسلہ پوچھا

☆☆

پرستشِ حال کی دیوار اٹھائی نہ گئی
درمیاں اب کے کوئی بات نہ آئی نہ گئی

جس کے اشعار میں اُس کا ہی سراپا لکھا
وہ غزل اس سے کسی طرح چھپائی نہ گئی

کبھی گلچیں کبھی بجلی کبھی صیاد خزاں
اپنے گلشن سے کسی طور تباہی نہ گئی

شہرِ دیدار میں سنسان ہیں گلیاں تب سے
کوئی بستی بھی ترے بعد بسائی نہ گئی

انگلیاں کاٹ کے لکھی تھی وصیت جس نے
اُس کے بچوں کے مقدر کی سیاہی نہ گئی

کل بھی محفوظ رہیں اپنی فصیلیں یارب
شکر ہے آج بھی دیوار گرائی نہ گئی

اپنی غزلوں میں نہ ابہام نہ اسرار ایازؔ
فلسفے والی غزل ہم سے سنائی نہ گئی

•

کب تک فریب کھاؤ میاں رات ہوگئی
اٹھ کر دیا جلاؤ میاں رات ہوگئی

دن بھر اُسی کی راہ میں آنکھیں بچھی رہیں
نظریں نہ اب چراؤ میاں رات ہوگئی

برسات تیرگی کی ہر اک سو ہوئی تو ہے
پلکیں نہ اب بچھاؤ میاں رات ہوگئی

دن بھر جو زخم کھائے ہیں ان کا خیال ہے
مرہم تو اب لگاؤ میاں رات ہوگئی

آسیب شام ہوتے ہی پھرتے ہیں چار سُو
خود کو کہیں چھپاؤ میاں رات ہوگئی

سوئی پڑی رہی ہے جو دن بھر غزل ایاؔز
جا کر اُسے جگاؤ میاں رات ہوگئی

عشق کا دورِ جنوں بھی تو گذر جائے گا
چڑھتا دریا بھی کسی روز اتر جائے گا

آج ممکن ہے مرے حق میں گواہی دے دے
کل پہ چھوڑا تو یہی شخص مکر جائے گا

آج کی رات اُتر آئے گا سورج لیکن
گھر سے باہر جو رہے گا تو ٹھٹھر جائے گا

وہ عجب شخص ہے زندہ ہے ازل سے اب تک
اُس کو چھو لے گا اگر کوئی تو مر جائے گا

رات کے وقت جو آئے ہو شریفوں کی طرح
تجھ کو اس حال میں دیکھے گا تو ڈر جائے گا

جب پہاڑوں سے اُتر آوَ بتانا مجھ کو
روٹھے بچوں کو منا لاوَ بتانا مجھ کو

میں کسی سایہء دیوار میں سوتا کب تک
کوئی دیوار گرا جاوَ بتانا مجھ کو

ہر شہنشاہ نے پہنا ہے یہاں خوب لباس
شعر میرے جو سمجھ پاوَ بتانا مجھ کو

جب تلک رہنے کو جی چاہے یہاں رہ لینا
جب بھی جی چاہے چلے جاؤ ، بتانا مجھ کو

آج قسمیں جو ترے پیار کی کھاتا ہے ایاز
کل فریب اُس سے اگر کھاؤ ، بتانا مجھ کو

☆☆

سفید جسم پہ کچھ داغ کالے کالے تھے
اسے خبر نہیں کیا روگ اُس نے پالے تھے

یہ کہہ کے اس نے وہیں اپنا ہاتھ کھینچ لیا
ہمارے منہ میں کسی اور کے نوالے تھے

نہ جانے کون سا جادو تھا بانسری میں بھی
عجب وہ دودھ بھرے تھن عجب گوالے تھے

نہ جانے کون سے منتر پڑے تھے جوگی نے
مرے جنوں کو بہت دیر تک سنبھالے تھے

تمہارا در ہی فقط ایک در کھلا پایا
وگرنہ تیری گلی میں ہزار تالے تھے

عجب سفر تھا عجب منزلوں کا راہی تھا
نہ اُس کے پیر پہ مٹی نہ اُس پہ چھالے تھے

ہمیں تلاش تھی خود کو یہاں اندھیروں میں
ہماری تاک میں ورنہ کئی اجالے تھے

یہاں محاذ پہ جگنو ، وہاں دیے کی لو
اندھیری رات سے بھڑتے کئی جیالے تھے

ہر ایک شخص کو جھک جھک سلام کرتے تھے
نہ جانے کون سی بستی کے رہنے والے تھے

پیڑ ہے آندھیوں کے گھیرے میں
کوئی پنچھی نہیں بسیرے میں

شام سے پہلے لوٹ کر آنا
کچھ بھروسہ نہیں اندھیرے میں

جن کو مطلوب ہیں جواں سارے
میری بستی ہے اُن کے گھیرے میں

رات باغی یہیں پہ ٹھہرے تھے
چھوڑ آیا تھا خود سویرے میں

لوگ سہمے ہوئے اجالوں سے
کوئی ڈرتا نہیں اندھیرے میں

کوئی دیوار در نہیں محفوظ
اب کہاں چین ہے بسیرے میں

روز کہتا ہے مجھ سے یہ قاصد
نامہ لاؤں گا اگلے پھیرے میں

بین کا ناگ سے بھی رشتہ ہے
سانس باقی نہیں سپیرے میں

بات کرتا ہوں میں چل پتھر اٹھا
ہو مدلل بات تو خنجر اٹھا

آج تک تم نے سنی ہے کب مری
دستِ قاتل کہہ رہا ہے سر اٹھا

اب بھی ممکن ہے فضاؤں کا سفر
کچھ قدم چل اور کچھ شہپر اٹھا

سینۂ سنظور سے فریاد ہے
کٹ گریں سب تار وہ محشر اٹھا

سائباں جوں ہی ہوالے کر اڑے
بے دھڑک تو آسماں سر پر اٹھا

ہے سیاہی کا سمندر سامنے
خامۂ پُر نور سے گوہر اٹھا

☆☆

پھر پڑے کاروبار پھرتی ہے
ہر روش اب بہار پھرتی ہے

دل سے کہنا نہ در کھلا رکھنا
ہر گلی میں بہار پھرتی ہے

کچھ ہوا ہے کہیں پہ وادی میں
پھر ہوا بے قرار پھرتی ہے

آ کے ساحل پہ پھر پلٹتی ہے
موج کیوں بار بار پھرتی ہے

ہم تو سوئے نگار نکلے تھے
یہ ڈگر سوئے دار پھرتی ہے

گلستاں میں بہار کے جلوے
زخشِ گل پر سوار پھرتی ہے

لاکھ کوشش کرے کہ چھپ جائے
بنتِ گل آشکار پھرتی ہے

وفورِ شوق پئے وصل اس قدر پایا
قدم قدم پہ سرِ راہ کوئی سر پایا

اگر دراز تھی منزل سفر کٹھن پھر بھی
خدا کا شکر ، نہیں ہم نے راہبر پایا

ہمارا بخت جو بیدار تھا ہرا جنگل
کھلی جو آنکھ تو بن میں نہ اک شجر پایا

حصارِ ذات کے اندر کہاں ٹھہرتا ہے
شبِ دراز میں وحشی کو چاند پر پایا

ہر ایک شاخ پہ اب کے شرار اگتے ہیں
شب وصال درختوں پہ یہ ثمر پایا

☆☆

مجھے دار و رسن کی مفت میں جاگیر ملتی ہے
کسی معصوم سے شاید میری تصویر ملتی ہے

قلم ہونگے تمہارے ہاتھ یہ قانون کہتا ہے
بغاوت کے صحیفے سے تیری تحریر ملتی ہے

کہاں زلفوں کے پیچ و خم کی یاں تجوید ہو پاتی
کتابوں میں کہاں اس عشق کی تفسیر ملتی ہے

ہرے دیکھے ہیں ہم نے یہ سلگتے جارہے منظر
کہو تو ایسے خوابوں کی کہیں تفسیر ملتی ہے

دلوں سے دل اگر ملتے تو کوئی بات بھی ہوتی
مرے گھر سے تمہارے گھر کی گو تعمیر ملتی ہے

وہی میرے بدن پر لمس پھر محسوس ہوتا ہے
نہ جانے کس جگہ پر زلف سے زنجیر ملتی ہے

محبت کرنے والے زندگی میں مل نہیں پاتے
سنا ہے خلد میں رانجھے کو آخر ہیر ملتی ہے

وہی شعر و سخن کا میرؔ آخر کار کہلائے
مریدی جس کو قسمت سے تمہاری میرؔ ملتی ہے

مری آنکھوں میں اس کی شکل کچھ ایسے سمائی ہے
ہر اک چہرے سے میرے یار کی تصویر ملتی ہے

نہیں لکھی جو قسمت میں کوئی شے مل نہیں سکتی
مگر وہ بھی بزورِ بازوئے تدبیر ملتی ہے

ہمیں تو آپ ہی سے زندگی کشمیر ملتی ہے
"وطن کے نام سے انسان کو توقیر ملتی ہے"

☆☆

ہے ترے شہر کی ہوا کیسی
سانس لینا بھی ہے سزا کیسی

چارہ گر سے گلہ نہیں کرتے
عشق کے درد کی دوا کیسی

رات ہی رات ہے ہمارے یاں
صبح کیسی یہاں صبا کیسی

اس شہر میں سبھی تو بہرے ہیں
پھر یہ مینار سے صدا کیسی

عمر اپنی دراز کیا کیجئے
ان بزرگوں کی یہ دعا کیسی

کوئی آہٹ نہیں نہ دستک ہے
یہ مہک آئی ہے ہوا کیسی

ڈھانپتے ہیں بہار کو کیسے
اس بدن پر سجے قبا کیسی

سر پہ کوسوں نہ آسماں دیکھا
اس سفر میں عجب سماں دیکھا

جو زمیں بادلوں نے ڈھانپی تھی
ہم نے اس پہ بھی سائباں دیکھا

کوئی طوفاں یہاں نہیں آیا
تنکے تنکے وہ آشیاں دیکھا!

ٹوٹی کشتی یہ ناخدا دیکھی
پھڑپھڑاتا وہ بادباں دیکھا

اب کے صحرا سے ریت غائب تھی
اپنے پہلو میں آسماں دیکھا

ہم نے خوشیوں کے پل کئی دیکھے
ایک غم ہے کہ جاوداں دیکھا

زلزلہ تھا ہنوز بستی میں
بن رہا اک نیا مکاں دیکھا

کوئی خامی رہی ایازؔ کہیں
جس کو دیکھا تو بدگماں دیکھا

☆☆

روشنی تیرے قلم سے جو چھلکتی ہے ایاؔز
صفحۂ نُور پہ چمکے ہیں یہ اشعار سیاہ

چاند ہے بام پہ مانگے گا اجالا لے کر
رات کے زرد اندھیروں میں ہیں اشجار سیاہ

چاند سے چہرے چمکتے ہیں سروں پر لیکن
آج کے دور کے ہر شخص کا کردار سیاہ

میں نے بھی دوست تتبع میں غزل لکھ ڈالی
کردیا میں نے بھی قرطاس کو بیکار سیاہ

اس دشتِ نا مراد میں کوئی ندا نہیں
شب کی جبینِ شوق پہ لکھی دعا سیاہ

دیتا ہے روشنی تو بجھاتا ہے آنکھ بھی
کوئی فقیر اب کے نہیں بے ریا سیاہ

ہم نے ہزار رنگ میں دیکھا تو ہے اسے
آخر ہماری آنکھ میں ہے کبریا سیاہ

ہم ایسے دیدہ ور بھی نہیں ہیں رفیقؔ جی
سورج کو دیکھ لیں تو کہیں مرحبا سیاہ

جب سے کسی کی زلف سے ہم آشنا ہوئے
اپنے ایاؔز ہم کو لگیں دست و پا سیاہ

سرما کی دھوپ ہے یہ یہاں روشنی کہاں
چادر سفید ہے تو مگر جابجا سیاہ

ٹوٹا نہیں وہ خیر سے لیکن یہ دیکھنا
رشکِ جمالِ عکس ہوا آئینہ سیاہ

بجھا دو آگ کہ سیلاب آنے والا ہے
امیرِ شہر کا کہنا ہے آب آنے والا ہے

ہر ایک شخص نے تعبیر اپنی سوچی ہے
سنا ہے شہر کے ناظم کو خواب آنے والا ہے

تم اپنی آنکھ سے چشمے تلاشتے رہنا
مری نظر میں ہمیشہ سراب آنے والا ہے

کسی نے رختِ سفر باندھتے اسے دیکھا
نہ جانے کسی پہ نیا اک عذاب آنے والا ہے

امیرِ شہر کا دعویٰ ہے آب آنے والا ہے
مجھے خبر ہے کہ سیلاب آنے والا ہے

ایاؔز تم بھی کھلو اب بہار آئی ہے
ہر ایک شاخ پہ تازہ گلاب آنے والا ہے

حال کچھ عمرِ گریزاں پوچھ لے
کس طرح ہیں پا بجولاں پوچھ لے

ہم نے کیسے آج کی شب کاٹ لی
پوچھ لے صبحِ درخشاں پوچھ لے

تازہ زخموں کے تبسم کی دلیل
کھلکھلا کر رویے خنداں پوچھ لے

ہے سرِ افلاک تاروں کا ہجوم
کیا ہوا وہ ماہِ کنعاں پوچھ لے

فصلِ گل واقف ہے ہر اک بھید سے
راز ہائے کہنہ دہقاں پوچھ لے

گل کہ آید در چمن نازک بدن
ساتھ کیا لایا ہے ساماں پوچھ لے

لو بہار آئی مگر کیا آئے گا
گل بدن وہ گل بداماں پوچھ لے

اور ہیں جو صاحبِ کردار ہیں
ہم جہاں میں غازیء گفتار ہیں

زندگانی ہے چلی جاتی مگر
لحہ لحہ ہم یہاں لاچار ہیں

سر برہنہ لوگ ہیں اس شہر میں
ایک ہی ہم صاحبِ دستار ہیں

اس جگہ اب چارہ سازی ہوچکی
یاں مسیحا خود ابھی بیمار ہیں

موردِ الزام اپنے قتل کے
ہم لہو میں تر کوئی تلوار ہیں

اپنا سودا کرنے آئے ہیں یہاں
راستے میں ہم سجے بازار ہیں

ایک ٹہنی کٹ گری ہے طایرو
کاٹ پھینکا ہو شجر ایسا نہیں

شاخِ صندل پر اُگے دیکھے نبات
سارے عالم میں ثمر ایسا نہیں

درد دل کا تیرے ہاتھوں ہو علاج
مرض ایسا چارہ کر ایسا نہیں

ہے کہاں زادِ سفر جو چل پڑیں
ہم نے باندھی ہو کمر ایسا نہیں

ہے خلاؤں سے پرے مسکن مرا
ہم رہیں گے چاند پر ایسا نہیں

ہے فلک جب سے خیر خواہوں میں
کچھ اثر اب نہیں ہے آہوں میں

پھر ٹھنی ہے جو کجکلاہوں میں
یہ بھی لکھ دو مرے گناہوں میں

خون بہتا نہ شاہراہوں میں
عقل ہوتی جو بادشاہوں میں

شرم باقی نہیں نگاہوں میں
ہیں گھرے جا رہے گناہوں میں

☆☆

اب بھی موقع ہے گر نکل جائیں
معرکہ سخت ہے توٹل جائیں

کھوٹے سکے ہیں جیب میں لیکن
کون جانے کہیں پہ چل جائیں

کس کو پہنچانتی ہے اب کی بار
ایک جنبش پہ دل دہل جائیں

خوف کی رات کا بھروسہ کیا
آج ٹھہریں یہیں پہ کل جائیں

ہم تو سورج نہیں مگر پھر بھی
شام ہوتے ہی ہم بھی ڈھل جائیں

ان کی باتوں میں کچھ نہیں لیکن
پھر بھی باتوں سے ہم بہل جائیں

برف جم جائے تو نمک چھڑکیں
سنگ دل اشک سے پگھل جائیں

وہ جوانی ایاؔز گزری ہے
آخری وقت ہے سنبھل جائیں

ہم کہاں کے سوار ہوتے تھے
راستے کا غبار ہوتے تھے

لوگ سارے اسی کے بندے تھے
ایک پرودگار ہوتے تھے

کوئی تکلیف میں اگر ہوتا
غیر بھی بے قرار ہوتے تھے

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی
ایسے بھی اشتہار ہوتے تھے

راز جو بھی چھپائے جاتے تھے
خود بخود آشکار ہوتے تھے

عشق کرنے میں دن گزرتے تھے
ایسے بھی کاروبار ہوتے تھے

بام پر چاند جب چمکتا تھا
جرم کچھ بار بار ہوتے تھے

☆☆

جو کوئی شخص ہے زمانے میں
وہ مقید ہے قید خانے میں

اس نے جو بھی کہا سنا میں نے
اب نئی بات کیا بہانے میں

زندگانی کا ماحصل دو پل
اس کے آنے میں اور جانے میں

کہہ گیا وہ سپاٹ لہجے میں
موڑ کیا کیا نہ تھے فسانے میں

ایک پل ہی کا فاصلہ ٹھہرا
تجھ کو کھونے میں اور پانے میں

آخری وقت پیار کیا کیجئے
عمر گزری ہے آزمانے میں

پانی صحرا صحرا دے
مجھ کو دریا دریا دے

آج کڑکتی دھوپ سہی
کل کو اپنا سایا دے

ریزہ ریزہ بانٹ سکوں
دل بھی مجھ کو ایسا دے

نیلے نیلے ساگر میں
مجھ کو ایک جزیرہ دے

آنے والے موسم میں
خوشبو کا اک جھونکا دے

کالی کالی راتوں میں
ایک چمکتا تارا دے

سونی سونی پلکوں پر
خواب سہانا کل کا دے

☆☆

چڑھتا دریا اُتر گیا میں بھی
سر سے پانی گزر گیا میں بھی

رات کی تو فصیل اونچی تھی
پار کیسے اتر گیا میں بھی

اس میں تو بھی تو ٹوٹ پھوٹ گیا
ریزہ ریزہ بکھر گیا میں بھی

پانچ بجتے ہی لوٹ آتا ہوں
اب کے شاید سدھر گیا میں بھی

اس چورا ہے پہ بھیڑ اتنی تھی
تو نہ آیا تو گھر گیا میں بھی

تُو نے دیکھا مجھے تو گھبرا یا
اپنے سائے سے ڈر گیا میں بھی

دن میں ثابت تھا اور سالم بھی
شام ہوتے بکھر گیا میں بھی

بند کمرے کی کھڑکیاں رکھنا
پھر کتابوں میں تتلیاں رکھنا

تپتے صحرا پہ شبنمی سائے
میرے ماتھے پہ انگلیاں رکھنا

سردیوں میں ٹھٹھر کے سیکھا ہے
گھر میں سوکھی سی لکڑیاں رکھنا

جو بھی تنکے سمیٹنے نکلے
گھات میں اُس کی بجلیاں رکھنا

گھر گر ہستی کا راز اتنا ہے
گھر میں اپنے نہ آندھیاں رکھنا

☆☆

مری ماں نے مجھ کو جنم جب دیا تھا
میں لاشوں کے انبار پر جاگرا تھا

جہاں پر تمہاری رِدا چھن گئی تھی
وہیں پر ہمارا بھی بازو کٹا تھا

یہیں پر اسے جان دینے کی ضد تھی
یہیں سے وہ پرچم اٹھائے چلا تھا

مجھے سات چہروں کی صورت ملی تھی
تذبذب میں ہر اک مجھے دیکھتا تھا

میں لوگوں کی اِس بھیڑ میں سوچتا ہوں
مرا نام کیا ہے مرا نام کیا تھا

☆☆

مجھ میں جو بھی رہتا ہے
شعر وہ اچھے کہتا ہے

دیواریں پھر ہلتی ہیں
مجھ میں پھر وہ جاگا ہے

خود سے بھی پہچان نہیں
وہ بھی کتنا تنہا ہے

برسوں میرا سنگی تھا
اب وہ ساتھی تیرا ہے

صحراؤں میں رہتا تھا
پانی میں اب ڈوبا ہے

میں کب اس کے جیسا تھا
وہ کیوں میرے جیسا ہے

ہم نے دل سے مان لیا
ناصر شاعر اچھا ہے

☆☆

(۱) ناصر کاظمی

رات اِس کمرے میں آ کر چاند بھی روتا رہا
سارے عالم سے جڑا ہے میرے غم کا سلسلہ

برف کی اجلی سی چادر تان کر سو جائے گا
میرے باغیچے کا مالی اس قدر بوڑھا نہ تھا

اُس کی ضد پر ہم نے چپو بھی حوالے کر دیئے
اب ولر ہے ناؤ ہے اور فرش ہے ٹوٹا ہوا

دل دھڑکنے کا سبب تاروں سے پوچھا تھا مگر
سوکھا پتہ ایک میرے سامنے آکر گرا

اب تمہاری زندگی کی دھوپ ڈھلتی ہے ایازؔ
راہ سونی رات کالی تو کدھر کو جائے گا

پھر لہو میں اُتر گیا شاید
آنکھ تک آکے ڈر گیا شاید

اب سیاہی سے خوف آتا ہے
مجھ میں سورج اتر گیا شاید

میں کہ تھا اک مکاں کرائے کا
چھوڑ کر مجھ کو گھر گیا شاید

رات دریا میں اک تلاطم تھا
پار کوئی اُتر گیا شاید

صبح آئی ہے آج کچھ پہلے
رات بیمار مر گیا شاید

خدا گواہ اگر پائمال ہم نے کیا
جناب عشق تجھے لازوال ہم نے کیا

ملے جو عشق تو اترا کے کہنے لگتا ہے
دل تباہ ! تمہارا یہ حال ہم نے کیا

گئی جو جان گئی دار سے نہیں اترے
رواج پھر سے وفا کا بحال ہم نے کیا

یہ اور بات کہ تجھ سا نہیں کوئی پھر بھی
کسی سے پوچھ تجھے بے مثال ہم نے کیا

لکھی ہے ایسی غزل جو ایاؔز برسوں میں
سنیں جو داغ کہیں گے کمال ہم نے کیا

☆☆

سردیوں کی بات ہی کچھ اور ہے جی
دھوپ کی سوغات ہی کچھ اور ہے جی

ہر طرف جلوے بکھیرے چاندنی
ہجر کی یہ رات ہی کچھ اور ہے جی

عشق کی دنیا الگ دنیا نہیں
عاشقوں کی ذات ہی کچھ اور ہے جی

ساتھ ہے جس کے ستاروں کا جلوس
چاند کی بارات ہی کچھ اور ہے جی

مجھ کو خوشبو بھیجتا ہے دور سے
پھول کی سوغات ہی کچھ اور ہے جی

نور کی وادی میں پورے چاند سے
نور کی برسات ہی کچھ اور ہے جی

☆☆

اُس کا اپنا ایک ہنر تھا
لفظوں کا وہ جادوگر تھا

اُس کے آتے خوشبو پھیلے
پھولوں کا وہ پیغمبر تھا

نرگس اُس کی بینائی تھی
ایسا ہی وہ دیدہ ور تھا

اُس نے مجھ کو منزل سمجھا
میرے آگے اور سفر تھا

شام سے پہلے سب ہی نکلے
آنگن میں بس ایک شجر تھا

بستی بستی ڈھونڈ رہا ہوں
میرا اپنا کوئی گھر تھا

☆☆

پوچھنے کو خبر نہیں آتا
اب کوئی بھی اِدھر نہیں آتا

سیکھنے سے ہُنر تو آتا ہے
شاعری میں اثر نہیں آتا

روشنی گُل ہوئی کہ بینائی
اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا

ہر سفر میں جو ساتھ رہتا ہے
ساتھ لیکن وہ گھر نہیں آتا

ایک طایر سے دل لگا بیٹھے
اب وہی بام پر نہیں آتا

چاند جب سے گلی میں کھلتا ہے
بام پر وہ قمر نہیں آتا

آسمانوں میں ایک طایر ہے
جو کبھی فرش پر نہیں آتا

سیب کے پیڑ سب ہرے لیکن
ان پہ اک بھی ثمر نہیں آتا

ہر طرف یاس کا ہی صحرا ہے
آس کا اک شجر نہیں آتا

رات بھر ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
اس گلی میں وہ در نہیں آتا

کچھ تو اس میں بھی مصلحت ہوگی
ہم سے ملنے وہ گھر نہیں آتا

☆☆

یہی وہ موج ہے جس سے لگاؤ ایسا تھا
وہ ڈوبتا ہی گیا تھا بہاؤ ایسا تھا

میں اُس سے دُور ہی رہ کر نکل گیا ہوتا
مجھے بھی کھینچ لیا تھا "سبھاو" ایسا تھا

اگرچہ ایک ہی کمرے میں رات گزری تھی
میں اُس کو دیکھ نہ پایا تناؤ ایسا تھا

ملا تو سب سے وہ ہنس کر بہت سلیقے سے
کوئی نہ دیکھ سکا اُس کا گھاؤ ایسا تھا

کڑکتی دھوپ میں وہ تھا چنار کا سایہ
جسے نہ چھوڑ سکا میں پڑاؤ ایسا تھا

جہاں ہم تمہاری پناہوں میں تھے
وہاں سبز سائے بھی راہوں میں تھے

میاں دھول آنکھوں میں جھونکی گئی
کئی لوگ میری نگاہوں میں تھے

زمانہ مرے ساتھ تب بھی نہ تھا
مگر تم مرے خیر خواہوں میں تھے

وہی محتسب ہیں انہیں کیا کہیں
وہ شامل ہمارے گناہوں میں تھے

کہیں پر تو بجلی گری ہے ایازؔ
کئی کارواں اب بھی راہوں میں تھے

تاروں سے پوچھتے ہیں کبھی کہکشاں سے ہم
مصروف گفتگو ہیں ابھی آسماں سے ہم

بجلی گری تھی دُور کہیں رات ہم نشیں
ہو کر اُٹھے ہیں خاک ابھی آشیاں سے ہم

تیری تو خامشی میں کئی راز تھے رقیب
مایوس ہو گئے ہیں لب دوستاں سے ہم

اپنے لہو سے ہم نے جو لکھی تھی حرفِ حرف
خارج ہوئے ہیں آج اُسی داستاں سے ہم

خوشبو گلاب کی جو اُڑی کھو گئی ایازؔ
ایسے اُٹھے ہیں آج تیرے آستاں سے ہم

☆☆

ٹکڑے ٹکڑے جب بٹ جاؤں شام گئے
دن کا سارا قرض چکاؤں شام گئے

گھر سے چلتے میں نے اکثر سوچا ہے
شاید ہی میں لوٹ کے آؤں شام گئے

سارا دن اس الجھن ہی میں بیت گیا
کیسے اپنا دل بہلاؤں شام گئے

دھوپ کے مارے لوگوں کو بھی صحرا میں
مل جاتی ہے پیڑ کی. چھاؤں شام گئے

کس کاندھے پر اشک بہاؤں شام گئے
کس کو اپنے زخم دکھاؤں شام گئے

پر پھیلائے مرغا بولا میر ایازؔ
جاگا میرے من کا گاؤں شام گئے

شب فراق میں مرے وہ بال و پر کتر گیا
پرند اُس کی یاد کا نئی اڑان بھر گیا

یہاں پہ خون بہہ گیا وہاں پہ لاش گر پڑی
نہ جانے کون شخص تھا سفر تمام کر گیا

کسی کی نیند ٹوٹتی کوئی تو رات جاگتا
اسی نگر میں رات کو کسی کا خواب مر گیا

نہ طائروں کا غول ہی ہماری چھت پہ آرکا
نہ اپنے گھر کے سامنے وہ کارواں ٹھہر گیا

وہ دوپہر گزر گئی وہ سر کے بال جھڑ گئے
ایاز اتنی دیر میں ہمارا دن گزر گیا

☆☆

اندھیری رات نوحے گا رہی ہے
خموشی شہر بھر میں چھا رہی ہے

زمیں پر خون اتنا بہہ گیا ہے
ہواؤں میں بھی خوشبو آ رہی ہے

ہری وادی کا افسوں ٹوٹتا ہے
خزاں کچھ رنگ وہ دکھلا رہی ہے

کئی لاشوں کی فصلیں کٹ چکی ہیں
کہ دھرتی خون میں نہلا رہی ہے

گھروں میں شور بھی اب تھم گیا ہے
گلی سے فوج بھی اب جا رہی ہے

☆☆

الف سے اللہ ب سے باللہ بسمہ اللہ
تختی کشتی کاغذ دریا بسمہ اللہ

اونٹ قلم کا تیرا ساتھی سنگی ہے
کاغذ کا ہے پھیلا صحرا بسمہ اللہ

پاؤں تیرے چلتے چلتے تھک جائیں
زور سے بستہ تھامے چلنا بسمہ اللہ

بیتے پل کو یاد نہ کرنا بیٹا جی
آنے والے یُگ کا ہونا بسمہ اللہ

آنے والے موسم کا کیا ذکر کروں
آنے والا موسم تیرا بسمہ اللہ

آنے والی نسلوں کا ہے تو منشور
میرا بیٹا راجا بیٹا بسمہ اللہ

ذرا بھی وہ انداز بدلا نہ تھا
اسے میں نے مدت سے دیکھا نہ تھا

ہوا میں گلوں کی مہک تھی مگر
سمندر میں کوئی جزیرا نہ تھا

کرایے پہ اٹھتا تھا ہر روز وہ
اسے یوں کسی نے خریدا نہ تھا

سنا ہے کہ پیڑوں پہ رہتے تھے لوگ
زمیں پہ انہیں بھی بھروسا نہ تھا

گزرتے ہوئے موسموں کا لباس
تیری نیک نامی نے پہنا نہ تھا

ہماری راتوں میں چاندنی تھی
ہر ایک موسم میں روشنی تھی

تمہارے گیسو گھنے تھے
ہوا میں خوشبو تھی تازگی تھی

ہم اپنی تخلیق پوجتے تھے
ہماری فطرت ہی آزری تھی

خزاں رسیدہ شجر سے پوچھو
کبھی چمن میں بہار بھی تھی

وہ جس میں سنت کے تذکرے تھے
کتاب ہجرت میں کھو گئی تھی

ہم اپنا نوحہ بھی خود پڑھیں گے
کہ ہم نے اپنی مدح لکھی تھی

وہی چناروں کے سبز پتے
بہار آنگن میں آر کی تھی

☆☆

راستے منجمد پگھل جاتے
برف کے شہر سے نکل جاتے

کچھ چناروں کی آگ کی باتیں
کچھ خیالوں کے دیپ جل جاتے

کوئی دیرینہ دوست ہی آتا
ہم بھی فرقت میں کچھ بہل جاتے

کشتیاں، وازوان، موسیقی
لوگ جب چاندنی میں ڈل جاتے

اب تو لاشوں کی فصل کٹتی ہے
پیڑ کٹنے سے دل دہل جاتے

چوراہے پر پیڑ کھڑا ہے
کس کا رستہ دیکھ رہا ہے

کرنیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں
تم نے سورج کو دیکھا ہے

شام سے بیٹھا سوچ رہا ہوں
میرا تجھ سے کیا رشتہ ہے

مجھ کو بستی کے لوگوں نے
حال پہ میرے چھوڑ دیا ہے

دروازے پر میر ایاز
جانے کب سے آبیٹھا ہے

☆☆

وقت ہے اب بھی گر سدھر جائیں
شام ہوتے ہی اپنے گھر جائیں

ہم تو صحرا نہ تھے مگر پھر بھی
ریزہ ریزہ یوں ہی بکھر جائیں

چڑھتے سورج ہیں خوب شہرت ہے
کون پوچھے گا جب اتر جائیں

تورا بورا کی ان گپھاوں میں
رات کا وقت ہے کدھر جائیں

یہ تو سوچا نہیں کسی نے بھی
شہر سے بن ملے گزر جائیں

اگلا موسم کسی نے دیکھا ہے
عین ممکن ایآز مر جائیں

خود کو ہر وقت دیکھتا ہوگا
ہاتھ میں اس کے آئینہ ہوگا

اُس کی پہچان ہے یہی لوگو
اُس کے آتے ہی حادثہ ہوگا

خوب گزرے گی دُور صحرا میں
قیس صاحب سے رابطہ ہوگا

ہم ستاروں سے ہو کے آئیں گے
درمیاں اُن کے راستہ ہوگا

اُن سے ملنے کا سلسلہ ہو بھی
بات کرنے کا حوصلہ ہوگا

وہ عدالت ہی کالعدم ہوگی
میرے حق میں جو فیصلہ ہوگا

ڈل کے پانی میں عکس کس کا ہے
آئینے پر وہ آئینہ ہوگا

☆☆

درد ہے اب کہیں ذرا بھی نہیں
جسم میرا مگر مرا بھی نہیں

آپ کے گھر سے لاش نکلی ہے
آپ کے ہاں کوئی ڈرا بھی نہیں

بوڑھا پنچھی یہیں کہیں اُترا
دام کا رنگ تو ہرا بھی نہیں

رات فکرِ سخن میں گزری ہے
جسم اُس کا غزل سرا بھی نہیں

وہ محل بھی خرید کر نکلے
ایک سکے میں جو کھرا بھی نہیں

ہم تو ہوش و حواس کھو بیٹھے
جام اس نے ابھی بھرا بھی نہیں

درد ہلکا سا اب بھی ہوتا ہے
زخم دل کا اگر ہرا بھی نہیں

☆☆

ابر آئے گا دبے پاؤں کہاں جاؤ گے
باڑ میں ڈوب گیا گاؤں کہاں جاؤ گے

شعلے برسائے گا سورج تو چھپو گے کیسے
اب نہ وہ پیڑ نہ وہ چھاؤں کہاں جاؤ گے

راہ اب اور کٹھن ہے تجھے معلوم نہیں
زخم ہی زخم ہوئے پاؤں کہاں جاؤ گے

اسی رستے ظفر اقبال گیا تھا اک دن
وہ رہی اس کی کھڑاؤں کہا ں جاؤ گے

ایک میں نے ہی ترا ساتھ نبھایا اب تک
میں تجھے چھوڑ کے گر جاؤں کہاں جاؤ گے

ایک تم ہی میرے شعروں کو سمجھتے ہو ایاز
میں غزل کس کو سنا جاؤں کہاں جاؤ گے

خیر میں ہوں کہ شر میں ہوں
کب فروکش تمہارے گھر میں ہوں

سایا مجھ پر کسی کا ہے شاید
لوگ کہتے ہیں میں اثر میں ہوں

چشمِ بد سے بچائے گا مجھ کو
بخت میرا تری نظر میں ہوں

وہ تو سودُ و زیاں سے غافل ہیں
کوئی سودا سمائے سر میں ہوں

اُن کی خوشبو کہیں سے آتی ہے
عین ممکن ہے وہ سفر میں ہوں

اور کس سے وہ ملنے آئیں گے
ایک میں ہی تو اِس نگر میں ہوں

ہجر تھا یا وصال کس کا تھا
خواب تھا یا خیال کس کا تھا

سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے
دل میں ان کے خیال کس کا تھا

غیر سے ہم نے مات کھائی تو
اس میں کہیے کمال کس کا تھا

ہم گرے ہیں اگر بلندی سے
در حقیقت زوال کس کا تھا

بچ کے نکلے جو لاتعلق تھے
بچ نکلنا محال کس کا تھا

ریگ ساحل پہ نقش باقی ہے
جسم وہ بے مثال کس کا تھا

شعر سنتے ہیں میرا کہتے ہیں
ایسا نازک خیا ل کس کا تھا

بام پر چاند تھا مگر پھر بھی
چاندنی میں جمال کس کا تھا

تان ہم پر ہی آکے ٹوٹی ہے
پوچھیے گا ملال کس کا تھا

حق تو یہ ہے نہیں ملے اُن سے
پھر یہ کالر پہ بال کس کا تھا

پوچھئے کیا کسی نجومی سے
وقت کس کا ہے سال کس کا تھا

وہ جو رہتے ہیں صرف ماضی میں
کیسے جانیں کہ حال کس کا تھا

دار پر چڑھ گیا ایاز مگر
کس نے پوچھا سوال کس کا تھا

☆☆

لباس اس کا جو دھانی ہوگیا ہے
دوپٹہ آسمانی ہوگیا ہے

رگوں میں دوڑتا تو سرخ ہوتا
لہو آنکھوں میں پانی ہوگیا ہے

فنا ہوتے ہوئے سوچا جسے میں
وہی تو جاودانی ہوگیا ہے

لگی ہے آگ دل میں یا شجر میں
یہ نغمہ لن ترانی ہوگیا ہے

وہ جب سے لامکانی ہوگیا ہے
زمیں پر آسمانی ہوگیا ہے

کہاں جاتا وہ جنت سے نکل کر
وہیں جنت مکانی ہوگیا ہے

بھری محفل میں چھیڑا پھر کسی نے
وہ پھر سے پانی پانی ہوگیا ہے

جو دیکھی وسعتِ دامانِ قطرہ
سمندر پانی پانی ہوگیا ہے

وہ غافل دور ہم سے اس قدر ہے
عدم سے نیستانی ہوگیا ہے

ہو وصلِ یار بس اُن کی نوازش
برائے مہربانی ہوگیا ہے

شباب اُس کا جو قصرِ جاوداں تھا
وہی اب دارِ فانی ہوگیا ہے

بُلا لاؤ ایاز اُس شیشہ گر کو
خفا پھر یارِ جانی ہوگیا ہے

☆☆

میں شب سے سحر کے جو آثار مانگوں
میں فاروق مضطرؔ کے اشعار مانگوں

میں ظاہر کے سارے جزیرے ڈبو دوں
میں باطن کی موجوں کے اسرار مانگوں

وہی شخص سارے شہر میں ہے یکتا
اُسی شخص کا میں بھی پندار مانگوں

قبیلے کے سارے جواں قید میں ہیں
میں اِن کے عوض اِن کا سردار مانگوں

ابھی دشتِ امکاں سے باہر نہیں ہوں
عروسِ تمنا سے اقرار مانگوں

مرا فقر مجھ سے نہیں چھین لینا
کبھی مال وزر کے جو انبار مانگوں

اگر دے سکے تو فقط ایک چھت دے
نہ دروازہ مانگوں، نہ دیوار مانگوں

مرا چہرہ اموات میں ڈھونڈھتا ہے
میں جب بھی کبھی تازہ اخبار مانگوں

مرے گھر کا آنگن سکڑتا گیا ہے
جو بونے رہیں ایسے اشجار مانگوں

تمہارے لبوں سے جو اُترا لہو میں
وہی نغمہ پھر پھر کے ہر بار مانگوں

اگر گونگی بستی ہے میرا مقدر
کوئی سلب کرلے یہ اظہار مانگوں

☆☆

قتل کرتا ہے تو دستور نبھانا ہوگا
سر ہمارا تجھے نیزے پہ اٹھانا ہوگا

کوئی دیوار ہو پردہ ہو کہ چلمن جاناں
درمیاں آئے کوئی اُس کو ہٹانا ہوگا

اُس کا تابوت اٹھا پائے نہ بیٹا لیکن
باپ کے قرض کا بوجھا تو اٹھانا ہوگا

کینچلی بن کے وہ چمٹی رہی شہمار کے ساتھ
آج لکڑی کو سرِ بزم جلانا ہوگا

اب تو فرعون کی تقدیر کا سورج ڈوبا
آج سورج کو ہتھیلی پہ اگانا ہوگا

دل میں آجانے کا وعدہ تو کیا ہے اس نے
دلنشیں اس کا کوئی اور بہانا ہوگا

ہم جو کشمیر سے نکلے ہیں تو جموں ٹھہرے
دشتِ غربت میں کہیں پر تو ٹھکانا ہوگا

جس کی شاخوں میں پرندوں نے بسیرے ڈالے
اب وہی پیڑ اُسے کاٹ گرانا ہوگا

ہم شب و روز سلگتے ہیں اگر دوری میں
ہائے کشمیر کا موسم تو سہانا ہوگا

ہمہ تن گوش اسی طرح زمانہ ہوگا
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور فسانہ ہوگا

اس کی نظروں کو نہ لگ جائے مرا زخم کہیں
اس کی نظروں سے ہر اک زخم چھپانا ہوگا

مجھ کو دریا کے کنارے پہ یہ الہام ہوا
پھر نیا ایک شہر ہم کو بسانا ہوگا

شعر کہتے ہو تو اِس شہر میں مضطر ہے ایاز
ہر نیا شعر اسے جا کے سنانا ہوگا

بھگشو سے خواہشات کا بن مانگتی رہی
کشکولِ تن میں عمر تپن مانگتی رہی

سرگوشیاں سُنی تھیں درو بام نے یہاں
خالی تھی چار پائی بدن مانگتی رہی

وہ لاش اپنی چھوڑ کے بھاگا نہ جانے کیوں
اُس کی برہنہ لاش کفن مانگتی ہے

لے کر چراغ رات کو پھرتی تھی خامشی
گنجینۂ حروف سخن مانگتی رہی

دیکھا جو اُس نے ہم کو فراغت سے یاں کبھی
قسمت ہماری رنج و مُحن مانگتی رہی

موسم بہار کا بھی عجب کام کر گیا
اک بیل پھیلنے والی صحن مانگتی رہی

گھڑیاں ڈبوئیں کس نے سرِ شام پھر یہاں
دو پل سکون کے جو تھکن مانگتی رہی

کس کا نہ جانے لمس سمایا لحاف میں
رہ رہ کے رات مجھ سے بدن مانگتی رہی

ہم نے سراب دیکھے ہزاروں سراب میں
اک گونہ تشنگی تھی جو تن مانگتی رہی

خوشبو لباس شخص وہ گزرا یہاں سے تھا
صحرا کی ریت مجھ سے چمن مانگتی رہی

سرما کی سرد تیرہ و تاریک رات خود
رہ رہ کے در پہ آ کے پھرن مانگتی رہی

خود تیرگی سے سہمی ہوئی شب ، تمام شب
دستِ دعا اٹھائے کرن مانگتی رہی

پارس منی تھی ناگ کے منہ میں چھپی ہوئی
ناگن لپٹ لپٹ کے وہ پھن مانگتی رہی

دنیا نے ہم کو جور وخفا دے دیے ایاز
اِس داد کے عوض میں یہ فن مانگتی رہی

نقش بر آب تھی جوانی بھی
پھر گیا عشق اُس پہ پانی بھی

میری رُوداد بھی نہیں سنتا
اپنی کہتا نہیں کہانی بھی

کچھ تو اوراق ہیں گلوں میں بھی
کچھ صحیفے ہیں آسمانی بھی

شعر سنتے ہیں کہتے جاتے ہیں
اب تو سمجھایئے معانی بھی

چھوڑ کر وہ گیا چلو لیکن
چھوڑ جاتا کوئی نشانی بھی

حسن اس کا اسی کے ساتھ گیا
وہ کہ تھا آپ اپنا ثانی بھی

ہم ترے در سے اُٹھ نہ پائیں گے
چھوڑ دیں گے یہ دارِ فانی بھی

پھر وہی اندھا سفر پھر وہی تاریک رات
پھر وہ سارے وسوسے اندیشہ ہائے حادثات

اُس کو ٹھہرائیں تو کیسے موردِ الزام ہم
اب تلک پیدا ہوئی ہو ایک وجہ التفات

ہم پہ گزری ساعتیں وہ جب نظر آنے لگی
ایک چادر آسماں اور ایک مٹھی کائنات

گردشِ دوراں کے تابع ہجر بھی ہے وصل بھی
حسن اُس کا عارضی ہے عشق میرا بے ثبات

اُس کی قربت میں نہیں پُھولے سماتے ہیں ایازؔ
چار دن کی چاندنی ہے پھر وہی تاریک رات

ساحل ساحل گیلی ریت
پیروں نیچے ڈھیلی ریت

ساگر کو یرقان ہوا
ہر سو دیکھی پیلی ریت

نیل کمل جب کھلتا ہے
دِکھ جاتی ہے نیلی ریت

جسم سے آ کر لپٹی ہے
صحرا میں برفیلی ریت

پھولوں سے بھی نازک تھی
پہلے یہ پتھریلی ریت

دیکھ کے مجھ کو بجھتی تھی
پاؤں میں شرمیلی ریت

سرد بستر کی رات باقی ہے
یہ دسمبر کی رات باقی ہے

چاندنی کی ہوس ہے ہونٹوں پر
اُس گُلِ تر کی رات باقی ہے

ساری بستی پہ دن نکل آیا
میرے ہی گھر کی رات باقی ہے

شام ہوتے ہی کشتیاں ڈوبیں
اور سمندر کی رات باقی ہے

یوں تو خائف نہیں کسی سے میں
خوف کی ڈر کی رات باقی ہے

خیر سے دن گزر گیا لیکن
سنگ کی سر کی رات باقی ہے

شعر کہنے میں رات گزرے گی
سنگ کی سر کی رات باقی ہے

بجلیاں کوند کر گئیں کب کی
جلتے بجھتے شجر کی رات باقی ہے

ردائے شب اُٹھا کر پھینکتا ہوں
سحر کے منہ پہ چادر پھینکتا ہوں

وہی بچپن کی عادت ہے ابھی تک
میں ہر اک شے اُٹھا کر پھینکتا ہوں

بھرے بازار میں جو کٹ گئے تھے
پسِ دیوار وہ سر پھینکتا ہوں

اُسے لوگوں نے گھیرا تھا جہاں پر
وہیں پر میں بھی خنجر پھینکتا ہوں

وہی سُوکھی سی ٹہنی ہے نظر میں
اُسی پر میں بھی پتھر پھینکتا ہوں

گلی تیری، وہ لڑکا اک لفافہ
کُھلی کھڑکی سے اندر پھینکتا ہوں

اپنے ہر ایک کرب کو آخر سمیٹ کے
وہ سو رہا ہے درد کی چادر لپیٹ کے

اک طفلِ تند تیز نے مکتب سے بھاگ کر
ٹکڑے تھما دیے مجھے ٹوٹی سلیٹ کے

دن بھر بس ایک کام تھا پتھر سمیٹنا
زخموں کو اب گنوں گا میں بستر پہ لیٹ کے

شاید کہ اب مکان کی تزئین کر سکو
میں جا رہا ہوں آج ہر اک شے سمیٹ کے

بھونچال آنے والا ہے درویش نے کہا
تب سے ہوں انتظار میں ساماں سمیٹ کے

☆☆

گذرے ہوئے موسم کا پتہ مانگ رہا تھا
اک شخص جو مسجد میں دعا مانگ رہا تھا

جس شہر میں سانسوں پہ بھی تعزیر لگی ہے
اُس شہر کی خاطر وہ ہوا مانگ رہا تھا

ممکن ہے کہ دفتر میں ملاقات نہ ہوگی
یہ سوچ کے گھر کا وہ پتہ مانگ رہا تھا

وہ کب سے اندھیروں کا نگہبان ہوا ہے
وہ شخص تو سورج کی ضیا مانگ رہا تھا

اب اس سے نہ مڈ بھیڑ سر راہ کبھی ہو
جس شخص سے ملنے کی دعا مانگ رہا تھا

☆☆

گئے دن کا سورج یہی کہہ رہا ہے
کہ اس شب پہ واجب مرا خوں بہا ہے

شبِ ہجر کالی ردا ہے کہ جس میں
مجھے اس نے ہر شام دفنا لیا ہے

کبھی سبز شاخوں سے پتے جھڑے ہیں
مرے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوا ہے

مجھے بھی گھر وندے بنانے کی ضد ہے
سمندر بھی پاؤں تلک آچکا ہے

اسے اونچے پیڑوں سے نفرت ہوئی ہے
سمجھتا نہیں اس کا قد گھٹ گیا ہے

پگھلتی ہوئی برف یہ کہہ رہی ہے
کہ موسم کا پہلا شگوفہ کھلا ہے

کوئی اونچے پربت چوٹی سے اکثر
مرا نام لے کر مجھے پوچھتا ہے

☆☆

نظمیات

اعتراف

چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے
نہ شب کی طوالت کا شکوہ بجا تھا
نہ سورج کی پہلی کرن معتبر تھی
وہ ساری سپیدی فریبِ نظر تھی
پرندے بھی سچے پیمبر نہیں تھے
وہ صبح کا ستارہ سحر تھا فسوں تھا

اجابت ہماری دعا کی نہیں تھی
فضاؤں میں خوشبو صبا کی نہیں تھی
کلی کے چٹکنے کی آواز باطل
وہ مسجد کا مینار خاموش ہی تھا
سماعت ہماری ہی شور یدہ سر تھی
چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے
شب تیرہ و تاراب بھی جواں ہے
بہت دور کرنوں کا وہ کارواں ہے
ابھی دشت پر ہے سیاہی مسلط
ابھی شب کی چادر میں لپٹا جہاں ہے
چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے

اگر

اگر میرے کمرے میں مکیں
سناٹے کی دیوی
میرے بس میں ہو جائے
تو میں نغموں کی پازیب
اس کے پاؤں میں ڈالوں
الفاظ کی چوڑیاں
کلائی میں پہنا کر
''چھما چھم چھم چھم
باجو بند کھل کھل جائے''
اشاروں پر نچادوں

☆☆

ایک آواز

ایک آواز
سنساتی پھرتی
ایک کھڑکی کھلی
محلے کی کھڑکیاں
کھلتی گئیں
پھر سکوت طاری تھا
کھلی کھڑکیوں سے جھانکتے
سناٹوں نے سرگوشیاں کیں

آواز!

آواز!

میرے کمرے میں دم توڑ

میری کھڑکی سے باہر جھانکتے سناٹے

خاموشی چھا گئی

کھڑکیاں ایکا ایکی

بند ہوتی گئیں

اکیسواں جنم دن

زمیں سے کچھ اور
مٹی کھودی گئی
قبر کچھ اور گہری ہوگئی
چند اور اینٹیں
مقبرے کی خاطر
بوڑھا مزدور
ڈال کر گیا ہے
آج
اکیسواں گیارہ جون تھا

☆☆

متفرق اشعار

شہرتیں تو سمیٹ کر لے جا
میرے حصے کی تہمتیں رکھ دے

میں سپیدے کا پیڑ ہوں لیکن
برف نے میری ٹہنیاں توڑیں

ترے خط کا مضمون ہم بھانپتے ہیں
بہت کوششیں کیں، نہیں آسکا تو

کوئی دیپک نہ جلانے دے گی
رات بھی مجھ سے خفا ہے شاید

امیر شہر نے رستے بنا لئے لیکن
سروں سے سایہ شاخ چنار لے گیا

ہمارے بس میں نہیں تھا کہ اُس کو روک سکیں
یقین لے کے گیا ، اعتبار لے کے گیا

پری کو دیو زاد اب لے اڑیں گے
لئے ہاتھوں میں خنجر آ گئے ہیں

سورج بھی اک سنیاسی ہے مارا مارا پھرتا ہے
پربت پیچھے بن میں جا کر گٹھری اپنی کھولے گا

میں کالے پانی میں گھر گیا ہوں
مجھے بھی راہِ فرار دینا

ہجر کی نگری جل جائے گی
وصل کے گاؤں جانا ہوگا

گیت یہ میرا لیتے جانا
تنہائی میں گانا ہوگا

دل کے روگی ہی اکثر
اپنا بھید چھپاتے ہیں

اپنی قوم کے غیرت مند
سب کا خون بہاتے ہیں

زندگی ہم کو مل گئی ہوتی
ہم ترا انتخاب کر لیتے

میں خموشی کی لاش سے نکلا
تیری آواز کا لہو ٹپکا

وہ ایک آنکھ جو زرد ہوتی جاتی ہے
میں ایک دل کہ ابھی تک ہوں خوں سے وابستہ

گھر میں چولھا چکی تھی
ساگ دہی اور چاول تھا

سارے غول میں ہلچل تھی
ایک پرندہ گھایل تھا

میری ماں نے کہا تھا کل مجھ سے
تم بھی ہنستے تھے مسکراتے تھے

اس کے گیسو یاد آئے
ایک گھنا سا جنگل تھا

چہرے پر تھی دھوپ کھلی
آنکھوں میں کیا کاجل تھا

وہ بادلوں میں شگاف دیکھو
وہیں سے سورج نکل رہا ہے

گل کے اوراق رنگ سے خالی
یہ صحیفے ہیں آیتوں کے بغیر

ڈیڑھ کمرے میں زندگی گزری
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا

ایک گنبد نما عمارت دل
آنے جانے کا در نہیں دیکھا

سارا جنگل ہی جل گیا آخر
آگ نے تو شجر نہیں دیکھا

ایک بوتل میں وہ سما جاتی
اُس کو جادو سے میں پری کرتا

شاعری ہم پہ چھوڑ دینی تھی
مرزا غالب سپہ گری کرتا

تھے کس بدن کے خطوط ایسے
میں کھینچتا تھا شباب کس کا

وہ اپنے آپ کو ایسے ہی دیکھتا جائے
ہمیں تو عکس ہی کافی ہے عاشقی کے لئے

شام تک لوٹ کر نہیں آئے
کون جانے وہ راستے میں ہوں

کل کے اخبار میں خبر ہوگی
لوگ کہتے ہیں حادثے میں ہوں

تیرے جانے سے لوٹ آنے تک
اک زمانہ سا درمیاں گزرا

ایک نیزے پہ آج سورج تھا
سر کو چھو کر وہ آسماں گزرا

ہوں علی کے خاکِ پا سے معتبر
وہ مرے مشکل کشا ہیں کیوں نہیں

ایک جنگل آج بھی ہے میرے خوابوں میں کہیں
سایہء آسیب ہے کیا چشمِ آہُو دیکھنا

گھس رہا ہے بدن کا پیراہن
اُگ رہی ہے کپاس کھیتوں میں

جھڑ دیے برگ و بار پیڑوں نے
کون تھا بے لباس کھیتوں میں

شعر کہنے میں کیا ملا ہم کو
ڈھنگ کا کوئی کام کرنا تھا

یہ بھی الزام ہے مرے سر پر
میں نے کاٹا ہے میرا سر شاید

میں نے سایہ زمیں پہ دیکھا ہے
اک پرندہ ہے پیڑ پر شاید

تیری گلی کی خاک میں کوئی ملا ، ملا
ہونے کو عمر آئی ہے یوں ہی پڑے ، پڑے

مر گیا جو لوگ کہتے ہیں ایازؔ
اور جھوٹی ہو خبر ممکن نہیں

تجھ سے آج لپٹ کر دیکھیں
ناگن تیرے پھن میں کیا ہے

بھوکے بچے سوچ رہے ہیں
جانے کس برتن میں کیا ہے

روز جو مجھ کو یاد آتا ہے
میرے اس بچپن میں کیا ہے

مجھے لگتا ہے بدلا سا، بکھرتا سا یہ گلشن کیوں
وہی گُل ہے وہی خوشبو وہی سر وسمن بلبل

آج سُن لو ایاز کی غزلیں
ہاتھ آتا ہے بار بار کہاں

نیلے داغ بدن پر ہیں
یا اس کے زہریلے ہونٹ

بجھ گئی ہے کب کی میری کانگڑی
جل رہی ہے کس کی چادر دیکھنا

کوئی اونچے پربت کی چوٹی سے اکثر
مرا نام لے کر مجھے پوچھتا ہے
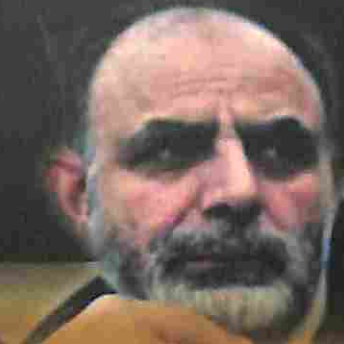
"ایاز رسول نازکی کی تخلیقی نادرہ کاری کو اپنے ذہن وشعور میں جذب کرنے کے بعد یہی احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا سب سے اہم تجربہ وہ اضطراب ہے جو ان کے فکر وشعور اور قلب وذہن میں ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ ایاز رسول نازکی کی شاعری کا ایک وصف اظہار کی بے ساختگی ہے۔ وہ نہ کسی کی معرفت کوئی بات کہتے ہیں اور نہ ایسی کہ معنی اور معنویت ہی گم ہو جائیں۔ ان کے فہم وادراک کی ایک ذاتی اور سماجی بنیاد ہے جو کسی قسم کی دانشورانہ ادعائیت سے پاک ہے۔

ایاز رسول نازکی کی شعری فضا حیرت ناک نہ سہی لیکن ندرت آمیز ضرور ہے۔ ایاز رسول نازکی کی فکر مینا کاری پچی کاری کے بغیر بھی خوبصورت نظر آتی ہے، بارش کی پہلی بوند کی طرح۔ اجالے کی مانند جیسے ابھی ابھی صبح ہوئی ہو۔ ایاز رسول نازکی غزل کے فن کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا ان کے کلام کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک فطری شاعر ہیں۔ ان کے ذہن کی روشنی، روح کی تازگی اور شعلۂ احساس، حرف کے پیکر میں ڈھل کر کسی شعلہ رو کی طرح نکھر گئے ہیں جو باکمال شاعر کی پہچان ہے۔

لیکن سب سے بڑی بات کہ ایاز رسول نازکی کے پاس اس ادبی بھیڑ میں اپنی شناخت کے لئے اپنا چہرہ ہے جو ان کے بہت سے اشعار میں اپنے ہونے کا بہ آواز بلند ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کے لیے میں ایاز رسول نازکی اور ادارہ تفہیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

ظفر اقبال

پاکستان، ۸ جون ۲۰۱۷ء

"ایاز رسول کی غزلوں پر ایک نظر ڈال کر مجھے اس مسرت بخش تعجب کا احساس ہوا کہ اپنے گھر کے ثقہ علمی و ادبی ماحول کے پروردہ ہونے اور اپنے والد بزرگوار میر غلام رسول نازکی کی روایت پسندانہ شعری شخصیت کے سائے میں اپنے شعری وجود کا ادراک کرنے کے باوجود وہ فکر وخیال اور اظہار واسلوب کی تجدد پسندی کو اپنا شعار بنانے پر مائل رہے ہیں۔ اس کا مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کا تخلیقی ذہن روایتی شاعری کے حاوی اثرات کو من وعن قبول لئے یا ان سے دب جانے کے بجائے وہ اپنی آزادروی کا تحفظ کرتا رہا ہے۔ یہ آزادروی روایت سے انحراف نہیں کرتی بلکہ روایت کے شعور کو شعری اظہار کی تہذیب کا موقع بہم کرتی ہے۔ اس طرح سے ایاز رسول نئی نسلوں کے ان گنے چنے شعراء میں شامل ہو جاتے ہیں جو روایت اور جدیدیت کے امتزاجی عمل سے لفظوں کی آئینہ بندی کرتے ہیں اور قاری کی حیرت کا سامان کرتے ہیں۔"

پروفیسر حامدی کاشمیری

(سرینگر)

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com